R. No. 218657 — Regd, No, 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۲۲-۸-۱۵-۲۲

ٹیلی فون - ۲۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ دس نئے پیسے

جلد ۲۲ - شمارہ ۳۲	ایڈیٹر - آل احمد سرور	۲۲ راگست ۱۹۶۳ء

ادار یہ

ہمارے اخبار اور رسالے

یہ خوشی کی بات ہے کہ اُردو میں اخباروں اور رسالوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے گو اُن کی اشاعت زیادہ نہیں ہے اگر اخباروں اور رسالوں کے چلانے والے اپنا اپنا مخصوص دائرہ بنالیں اور ہر پرچے کی کوئی خصوصیت ہو تو ہمیں یقین ہے کہ یہ بات اُس کی اشاعت کو بڑھانے میں مفید ہوگی۔ روزانہ اخبار کا کام تازہ ترین خبریں مہیا کرنا ہے۔ چند بڑے پرچوں کو چھوڑ کر بیشتر اُردو کے اخبار اس لحاظ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اُن کا خبریں فراہم کرنے کا اپنا انتظام نہیں ہے۔ اخباری سروسوں سے اُنھیں براہ راست خبریں کم ملتی ہیں۔ ٹیلی پرنٹر سے وہ کام نہیں لے سکتے۔ اُن کے نامہ نگار بڑے بڑے شہروں میں نہیں۔ ان کے پاس کالم نویس نہیں۔ ہفتہ وار اخباروں میں خبروں سے زیادہ حالیہ مسائل پر رائے ہوتی ہے۔ کم اخبار مضمون نگاروں کو معاوضہ دے سکتے ہیں۔ انھیں اشتہارات اس لئے زیادہ نہیں ملتے کہ ان کے خریداروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ خریداروں کی تعداد اس لئے زیادہ نہیں ہوتی کہ خریدار تصویریں اور اہم سیاسی، تہذیبی، ادبی، علمی مسائل پر مضمون چاہتے ہیں۔ اُن کے لکھنے والے کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی محض اللہ واسطے نہیں لکھ سکتے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اخباروں اور رسالوں کو کچھ علمی یا تہذیبی ادارے اپنا لیں یا ان کو ایسی لمیٹڈ کمپنیاں چلائیں جن میں عوام کے حصّے بڑی تعداد میں ہوں۔ موجودہ دور میں وہی اخبار اور رسالے کامیاب ہو سکتے ہیں جو اچھی اور صحت مند معلومات اس طرح پیش کریں کہ پڑھنے والوں کی دلچسپی بڑھے اور اُن کا ذہن روشن ہو۔ یوں چاشنی اور چٹخارا مہیا کر کے کچھ رسالے کافی روپیہ کما سکتے ہیں مگر اسے ادبی خدمت نہیں کہا جا سکتا، تجارت کہا جا سکتا ہے۔ ہاں اہم بات یہ ہے کہ سلیقے سے اور باقاعدہ انتظام کر کے ادبی خدمت کی جائے تو وہ مفید تجارت بھی ہو سکتی ہے۔

جس رسالے کو دیکھئے وہ مجموعہ مرکب ہوتا ہے۔ دو تین مضمون چار پانچ افسانے، تین چار نظمیں، دس بارہ غزلیں، دو ایک چلتے ہوئے تبصرے اور آدھی درجن ایڈیٹر کے نام تعریفی خط، یا من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو قسم کے مضمون نگاروں کے سرٹی فکٹ۔ ہر رسالہ چاہتا ہے کہ اس میں چند مشہور نام ہوں، وہ لکھنے والے پیدا نہیں کرتا کیونکہ ایڈیٹر بعض اوقات خود صلاحیت دریافت نہیں کر سکتا۔ جس طرح ہندوستان کے کرکٹ کے کھلاڑی باہر کی ٹیموں کے ساتھ ہر شہر کا دورہ کرتے رہتے ہیں، اسی طرح چند مشہور ناموں پر ہر رسالے کی کامیابی کا دارومدار سمجھا جاتا ہے۔

یہ سائنس کا دور ہے۔ اگر اخباروں اور رسالوں کی اشاعت بڑھانا ہے تو اُنھیں موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق بننا پڑے گا۔ اُن میں کوئی خصوصیت پیدا کرنی ہوگی۔ اُن کی کتابت طباعت کو بہترین رکھنا ہوگا۔ اُنھیں مصور کرنا ہوگا۔ اُن کی

فہرست ہماری زبان
موجودہ شمارہ

نکاسی کے لئے علیحدہ انتظام کرنا ہوگا اور ہر رسالے کے پیچھے جرأت رندانہ کے بجائے مالی وسائل فراہم کرنے کے لئے حکیمانہ شعور سے کام لینا ہوگا۔ بالائی طبقے سے کوئی امید رکھنا فضول ہے۔ یہ کام اُس طبقے کو کرنا ہے جو ادب کے ذریعے سے تہذیب و انسانیت کی خدمت کرسکتا ہے اور ادب کو صرف تخلیق تک محدود نہیں رکھتا بلکہ علوم کی پہنائیوں کو بھی اس میں سمیٹ سکتا ہے اور دوسری زبانوں کے کارناموں سے بھی اُردو دنیا کو آشنا کرسکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تاجر حضرات اس گوشے پر بھی قبضہ کرلیں گے اور پھر سستے نشے اور سنسنی خیز مواد سے عام ذوق کو بگاڑیں گے مگر اپنی تجوریاں بھر لیں گے۔ علم دوستوں اور ادب نوازوں کو اس مسئلے کی طرف سنجیدگی سے اور جلد توجہ کرنی چاہیے۔

سیربین

اُردو کی ترقی کیسے ہوئی؟ ادیب یہ کہتا ہے کہ اعلیٰ ادب پیش کرنے سے، شاعر سمجھتا ہے کہ مشاعرے ہوتے رہیں اور اس کا مجموعہ بکتا رہے تو خیریت ہے۔ ناشر اپنی کتابوں کی نکاسی سے اُردو کی ترقی پر حکم لگاتا ہے۔ اخبار نویس اپنی اشاعت کی رفتار سے اُردو کی ترقی کی رفتار ناپتا ہے۔ رسالے کا ایڈیٹر اپنے رسالے کے خریداروں کی تعداد دیکھتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے ممبر اپنی پارٹیوں کے انتخابی منشور کو دھیان میں رکھتے ہیں۔ اُردو کے اداروں کے معلم، طلبہ کی تعداد کے نیچے اوپر ہونے سے متاثر ہوتے ہیں، انجمنوں کے عہدہ دار اپنے جلسوں کی کامیابی سے فال لیتے ہیں۔ کچھ نیک نیت اشخاص جو اپنی دھن میں مگن ہیں، رسم خط کی بات چلاتے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اردو کی ترقی رومن رسم خط اختیار کرنے پر منحصر ہے، دوسرے کے نزدیک دیوناگری کو اپنانے پر۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو سڑکوں اور اسٹیشنوں پر اردو میں ہدایات نہ دیکھیں تو اردو پر فاتحہ پڑھ لیتے ہیں، یا فلم میں غزل کو اُردو کے لئے خوش آیند سمجھتے ہیں۔ شاید اپنی جگہ یہ سب لوگ سچے ہیں مگر ان سب کے پاس ادھوری سچائی ہے۔ ساری حقیقت کا عرفان آسان بھی تو نہیں۔ صوفی کثرت میں وحدت دیکھ سکتا تھا آج کل یہ مجموعی نظر کس کے پاس ہے۔

نہ جانے ہمارے افسانے کو کیا ہوگیا ہے کہ جنسیات کی دلدل سے نکل ہی نہیں پاتا۔ آج رسالوں میں بیشتر افسانے ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کے گرد گھومتے ہیں جو باتیں تو بڑی بڑی کرتے ہیں مگر ہیں بری طرح جنس زدہ (اگر اعصاب زدہ صحیح ہے تو جنس زدہ کیوں صحیح نہ ہو) کرشن چندر تو خیر اس کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ بیدی کو بھی ادھر چاٹ لگی ہے عصمت تو بانی فورت ہیں اور بانی کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ منٹو مرحوم کو تو جنسیات کی خارش تھی۔ اب ذرا کوئی اچھا افسانہ نگار ابھرا تو گھوم پھر کر وہ اسی نسخے پر آگیا۔ جنس بہت بڑی حقیقت ہے مگر ساری حقیقت نہیں۔ دیکھیں ہمارے افسانہ نگاروں کو اس کا احساس کب ہوتا ہے۔

پہلے اداروں، کانفرنسوں، سبھاؤں کا افتتاح ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مشاعروں کا بھی افتتاح ہونے لگا۔ اب نوبت یہ آگئی ہے کہ کسی کی کتاب چھپتی ہے تو اُس کا بھی افتتاح ہوتا ہے۔ ایک بڑا جلسہ کیا جاتا ہے جس میں کوئی وزیر یا نیتا خاص طور پر بُلایا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ مصنف کی تصویر لی جاتی ہے۔ یہ تصویر جلسے کی خبر کے ساتھ اخبار میں شائع ہو جاتی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب کوئی مشہور شاعر نظم کہے گا، یا کوئی افسانہ نگار افسانہ لکھے گا تو اس کا بھی افتتاح کسی وزیر یا بڑے افسر کے ہاتھوں ہوا کرے گا۔ لوگ ہمارے وزیروں اور افسروں کو خواہ مخواہ بُرا کہتے ہیں۔ بیچارے اتنی ادبی خدمت کرتے ہیں پھر بھی یار لوگ اعتراض سے باز نہیں آتے۔ کچھ نہیں تو یہی کہہ دیتے ہیں کہ انھیں شاید اور کوئی کام نہیں ہے۔

اثر صہبائی۔۔ادیب بریلوی

اور

محمود علی خاں کا انتقال

بہت افسوس کے ساتھ یہ خبر سُنی گئی کہ پاکستان میں اثر صہبائی، ادیب بریلوی اور محمود علی خاں صاحب کا انتقال ہوگیا۔ مرنے والے آخر دم تک اُردو کی خدمت میں لگے رہے اور اپنی کافی قلمی یادگاریں اُردو والوں کیلئے چھوڑ گئے۔ حضرت اثر صہبائی اُردو کے سربرآوردہ شعرا میں سے تھے اور حضرت ادیب سہارنپوری نے بھی اُردو شاعری میں اپنا ایک مخصوص مقام بنا لیا تھا۔ جناب محمود علی خاں جو شعروں کے سلسلے کی وجہ سے مشہور ہوئے اور تذکرۂ جگر نے ان کے ادبی ذوق پر مہر لگادی۔ ادارہ مرحومین کے پسماندوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ دعا ہے کہ ایسی مثالیں اُردو دنیا میں عام ہوں۔

نظر حیدرآبادی

حیدرآباد سے جوش صاحب کی علیحدگی کے حقیقی اسباب

مرحوم حیدرآباد سے جوش صاحب کی علیحدگی یا اخراج کے حقیقی اسباب" ہماری زبان" کے ۲۲ جون ۱۹۶۳ء کے شمارے میں نظر سے گزرے، اس کے راوی جناب حیرت بدایونی ہیں، جنھیں میں اپنا بزرگ کرم فرما سمجھتا ہوں اور جن سے نیازمندی میرے لئے باعث عزت ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ میں اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ حیرت صاحب اب عمر کی اس منزل میں ہیں کہ جہاں ان کی یادداشت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ زیر بحث روایت بھی حیرت ناک حد تک غلط بیانیوں کا شکار ہو گئی ہے۔ اوّل تو جوش صاحب کے حیدرآباد سے اخراج کا واقعہ اتنا اہم نہ تھا کہ اس پر خامہ فرسائی کی جاتی، نہ میرے لئے یہ ضروری تھا کہ اس قصے کے اصلی خدوخال کی نقاب کشائی کر کے اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرتا۔ اگرچہ راوی نے اپنے مضمون کی ابتدا میں لکھ دیا ہے کہ "چونکہ ابھی جوش صاحب اور اکثر وہ اصحاب جو واقف ہیں بقید حیات ہیں" اس لئے اس کی "تصدیق" بھی ہو سکتی ہے جوش صاحب تو تصدیق کر ہی دیں گے کیونکہ اس بے سر و پا داستان کے پڑھنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں، جوش صاحب ہی سے سن کر ہم تک پہنچائی گئی ہیں۔ لیکن اس "سازش" کو تیار کرنے والوں میں چونکہ میرے درویش صفت پدر بزرگوار اور ان کے دو کرم فرما جناب جوش بلگرامی مرحوم اور مولانا نیاز فتح پوری کو بتایا گیا ہے اور اتفاق سے اس کہانی کے دو اصلی کردار بقید حیات نہیں" اس لئے مجبوراً مجھے یہ مضمون لکھنا پڑا تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی قارئین کے پیش نظر رہے اور مستقبل کا ادبی مورخ اس ضعیف روایت کی بنیاد پر کوئی نئی عمارت نہ کھڑی کر دے۔

سب سے پہلے تو راوی کی ذہنی پراگندگی اور یادداشت کی خرابی کی ایک واضح مثال پیش کرنا ضروری ہے تاکہ آئندہ واقعات کے تجزیے میں آسانی ہو۔

"ہماری زبان" کے اسی ۲۲ جون ۱۹۶۳ء کے شمارے میں ان کا ایک بیان "معظم جاہ اور حیرت بدایونی" شائع ہوا ہے، جس میں وہ دربار معظم جاہ سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "غالباً ابن علی صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ میرا تعلق مہاراجہ سرکشن پرشاد کی پیشی سے بحیثیت ملازم باب حکومت رہا ہے اور میں نے مہاراجہ آنجہانی کے ساتھ شب و روز ان کی ڈیوڑھی میں مقیم رہ کر لگ بھگ پندرہ سال گزارے ہیں۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر باب حکومت کے معتمد تھے، انھوں نے مجھے باب حکومت میں ملازمت بھی دی اور مہاراجہ بہادر کی مصاحبت سے منسلک رہنے کی بھی اجازت دے دی۔"

خط کشیدہ جملے کی دلچسپ افسانہ طرازی سے قطع نظر کیجئے کیونکہ اتنی طویل مدت تک شب و روز مہاراجہ کے محل میں مقیم رہنے کی سعادت تو کسی مصاحب کو نصیب نہیں ہوئی۔ ابھی حیدرآباد میں بیسیوں ایسے افراد موجود ہوں گے جنھوں نے مہاراجہ کی آنکھیں دیکھی ہیں اور جو اس حیرت انگیز انکشاف کو پڑھ کر نقش حیرت بن کر رہ گئے ہوں گے، حیدرآباد کو چھوڑیے یہاں کراچی میں مہاراجہ کے دربار کے ایک اور مستقل حاضر باش مولانا ماہر القادری بھی حیرت زدہ سے ہیں! یہ تو جملہ ہائے معترضہ تھے، اب سنئے اسی راوی نے آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کے شائع کردہ انتخاب "حیدرآباد کے شاعر" (مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد) میں اپنے جو حالات زندگی چھپوائے ہیں ان میں ان کی ملازمت کے سلسلے میں یہ لکھا گیا ہے: "نان کوآپریشن کی تحریک سے متاثر ہو کر ۱۹۲۲ء میں دکن آ گئے، ابتدا میں مدرسۂ آصفیہ اور مدرسۂ اعزہ میں درس و تدریس کا کام کیا، پھر نواب صاحب کلیانی کے اتالیق مقرر ہوئے۔ مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد سے ملاقات ہوئی تو ان کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے اور مہاراجہ نے محکمۂ امور مذہبی میں ان کا تقرر کر دیا جس پر وظیفہ تک کام گزار رہے۔"

ملاحظہ کیا آپ نے راوی کی یادداشت کی خرابی کا عالم، "حیدرآباد کے شاعر" میں لکھوایا گیا کہ مہاراجہ نے ان کا تقرر محکمۂ امور مذہبی میں کیا اور اب وہ اپنے تازہ بیان میں فرماتے ہیں کہ نواب مہدی نواز جنگ نے ان کا تقرر باب حکومت میں کیا تھا۔ تازہ بیان میں یہ تازہ انکشاف بھی غور کیجئے جو راوی خود اپنی زندگی کے واقعات اس طرح گڈمڈ کر کے پیش کر سکتا ہے دوسروں کے بارے میں اس کی بیان کردہ روایات کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ مجھے حیرت صاحب کی نیت پر کوئی شبہ نہیں میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اس میں ان کا نہیں بلکہ ان کی پیرانہ سالی اور یادداشت کی خرابی کا قصور ہے۔ بہر حال اس پس منظر میں ان کی بیان کردہ روایت کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

اس روایت کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب ۱۹۲۴ء میں مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اقبال کا ایک سفارشی خط لے کر حیدرآباد آئے تھے اور ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد سے

چلے گئے۔ جوش صاحب کا سن پیدائش ۱۸۹۴ء ہے۔ اس اعتبار سے وہ اٹھائیس برس کی عمر میں حیدر آباد آئے اور لگ بھگ اڑتیس اکتالیس سال کے سن میں حیدر آباد سے چلے گئے۔ وہ دس سال تک جامعہ عثمانیہ کے ذیلی ادارے دارالترجمہ میں ناظر ادبی کی حیثیت سے کارگزار رہے، پانچ سو روپے مشاہرہ تھا، جوش صاحب کا دربار نظام دکن سے صرف اتنا ربط رہا کہ پہلی بار وہ مہاراجہ کے توسط سے ایک قصیدے کے ساتھ وہاں باریاب ہوئے اور اس کے بعد سال میں ایک بار نظام دکن کی سالگرہ کے موقع پر ایک قدیم رواج کے مطابق شہر حیدر آباد میں حاضر تمام گزیٹڈ افسران کے ساتھ نذر پیش کرنے دربار میں جایا کرتے تھے۔ نظام دکن سے جوش صاحب کی بے تکلف دوستی کے جو افسانے یار لوگوں نے پھیلا رکھے ہیں وہ محض من گھڑت اور بے بنیاد ہیں۔ دراصل یہ باتیں ایسے لوگ کرتے ہیں جنھوں نے تقسیم ملک سے پہلے بیاسی ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی نیم آزاد مملکت حیدر آباد کو نہیں دیکھا۔ مختصر یہ کہ نظام کی حیثیت تعلقداران اودھ کی سی نہیں تھی کہ جہاں شعراء کی معاصرانہ چشمکوں کے چرچے عام ہوں۔ ان کے دربار کے جاہ و جلال کا حال معلوم کرنا ہو تو علی گڑھ میں مقیم نواب صاحب چھتاری سے پوچھئے کہ ان کا اپنا حصہ تو دور کا جلوہ تھا۔ حالات کے اس پس منظر میں جوش صاحب کی "علیحدگی کے اسباب" پر غور کیجئے تو صورت حال واضح ہو جائے گی۔ حیرت صاحب نے پہلا سبب یہ بتایا ہے کہ "نگار" میں جوش صاحب کے کلام پر تنقیدیں شائع ہوئیں جن کو پڑھ کر انھوں نے ایک ہجو یہ نظم کہی (جس کا عنوان بھی انھیں یاد نہیں) اور منجملہ اور احباب کے علی اختر کو بھی سنائی اور علی اختر نے ہوش بلگرامی کے مشورے پر یہ نظم نیاز صاحب کو بھیج دی، ادھر ہوش صاحب نے نیاز صاحب کو حیدر آباد بلا لیا اور اس طرح ہوش و جوش کے قافیئے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ اگر ان واقعات کو صحیح مان لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات نے پورے دس برس کے بعد جوش صاحب کے خلاف یہ سازش کیوں کی؟ کیا جوش صاحب حیدر آباد کے اتنے عظیم عہدے پر فائز ہو گئے تھے، اور نظام کے ایسے محبوب مصاحب بن گئے تھے کہ ان کی دنیاوی ترقیات سے ان اصحاب کے دل میں رشک حسد کے جذبات پیدا ہو گئے؟ کیا اب سے تینتیس سال پہلے ادب کی دنیا میں جوش صاحب کا اتنا ارفع و اعلیٰ مقام متعین ہو گیا تھا کہ ان پر تنقید کرنا جرم ٹھہرتا اور لوگ اقبال کی شاعری اور شہرت پر رشک کرنے کی بجائے ان کی زندگی کے درپے ہو گئے؟ کیا معاصرانہ چشمک کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ مخالف پر زندگی کی راہیں مسدود کر دی جائیں؟ کیا قدیم وضع کے بزرگ اتنے چھچھورے ہوتے تھے؟ اوّل تو یہ بات غلط ہے کہ جوش صاحب کے کلام پر پہلے "نگار" میں تنقیدیں شائع ہوئیں اور بعد میں جوش صاحب نے کوئی ہجو یہ نظم کہی۔ کیونکہ نیاز صاحب اور جوش صاحب کے درمیان کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کے امکان کے بارے میں خود جوش صاحب نے "نگار" کے نیاز نمبر میں جو واقعہ لکھا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"یادش بخیر یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف "روح ادب" شائع ہوئی تھی اور میں اس زمانے میں آگرے گیا ہوا تھا۔ جہاں لطیف الدین احمد صاحب کے دانشکدہ پر حضرت نیاز سے مجھ کو پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں بھرپور جوانی کی طرف جا رہا تھا اور نیاز صاحب آغاز پیری کی جانب مڑنے والے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ نیاز صاحب نے اس ملاقات میں میری اس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم "جنگل کی شہزادی" کی مجھے دل کھول کر داد دی تھی۔ اور "روح ادب" پر تنقید کا بھی وعدہ کیا تھا (جو کبھی ایفا نہ ہو سکا) اس زمانے میں نیاز صاحب ڈاڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کے منہ پر ڈاڑھی مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں نیاز صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیاز صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے، اس وقت میرے پاس ذہانت کے سوا تھا ہی کیا۔ میری جھولی میں تو آج بھی بقدر حوصلہ علم و فکر کی پونجی نہیں ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تو مجھ پر علم و فکر کی چھاؤں تک نہیں پڑی ہو گی۔ نیاز کا سا آدمی مجھ کو منہ کیوں لگاتا۔ اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدر آباد میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی۔ اور میں نے ان کو ان کے میزبان ہوش بلگرامی سمیت اپنے گھر مدعو کیا، ہزار افسوس کہ میری وہ مخلصانہ دعوت میرے ایک قرابت دار دوست کی بے پناہ بدمستی اور شرمناک فحش کلامی کی بنا پر غارت ہو کر رہ گئی۔ وہ میری زندگی کی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ اس دعوت میں میرے دوست کی شرافت سے گری ہوئی فحاشی کی بنا پر نیاز صاحب اور ہوش دونوں کو میری جانب سے یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ یہ سب کچھ میرے ایما سے ہوا ......

...... نیاز صاحب کی بدگمانی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک "نگار" کے ہر پرچے میں مجھ پر تبرا کرتے رہے۔" اور اس کے بعد ہر چند ہر پرچے میں میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا۔ لیکن جب بھی ان کو موقع ملا (گو میرے خلاف لکھنے میں کبھی) ایک بار بھی تساہل سے کام نہیں لیا

(باقی صفحہ ۹ پر)

یٰسین علی خاں حیدرآباد

اے خدا یہ حال ہے جمہوریت میں فرد کا

ہے نئے دور کے جہاں میں گفتگوئے انقلاب	ہر دلِ مجبور میں ہے آرزوئے انقلاب
سیکڑوں دریا رواں ہیں آج سوئے انقلاب	بحرِ بے پایاں بنی ہے آبجوئے انقلاب

آدمِ خاکی تلاشِ آسماں میں مست ہے
ہر بلندی اب نگاہِ چارہ جو میں پست ہے

لیکن اب بھی آدمی سے آدمی انجان ہے	کوڑیوں کے مول اب بھی حرمتِ انسان ہے
سیکڑوں ایسے ہیں جن پر بے کسی قربان ہے	زندگی جن کی سراپا دردِ بے درمان ہے

پوچھنے والا نہیں کوئی کسی کے درد کا
اے خدا یہ حال ہے جمہوریت میں فرد کا

ہیم کو شیادی دامی

سوکھا پودا

حزیں مت ہو اے زندگی کے خزاں بخت پودے
کہ شاخیں تری خشک ہیں، پتیاں جل چکی ہیں
کوئی ملتفت تجھ پہ ہوتا نہیں، تیری وقعت نہیں ہے
کہ اب دشتِ ہستی کے خاروں کو بھی تجھ سے الفت نہیں ہے!!!
مجھے تیرے دکھ کا بہت دکھ ہے اور میں اسی واسطے
ان دنوں "عشق" کرنے لگا ہوں۔
حبیب اپنا، اک پھول ہے، جس کی ہر پنکھڑی
جان دیتی ہے مجھ پر ——
مگر تابکے؟
جانتا ہوں کہ شاخِ محبت سے اس کو
کسی دن کوئی توڑ لے گا۔
وہ دن ہار کا میرے ہوگا!
یہی سوچ کر "عشق" کرنے لگا ہوں
کہ جس دن مری ہار ہوگی، اسی دن تری جیت ہوگی۔
ادھر دل میں جب ہوک اٹھے گی میرے
تو آنکھیں مری ہو کے نم کام آئیں گی تیرے

حزیں مت ہو اے زندگی کے خزاں بخت پودے
میں اشکوں سے اپنے، تری آبیاری کروں گا!

غزلیں

اختر بستوی

کیا جانے کہاں ٹھہرے گی حالات کی گردش	دنیا کی نظر سہمی ہوئی دیکھ رہا ہوں
میں وقت کے صحراؤں میں بھٹکا ہوا راہی	ملتی ہے کہاں چھاؤں گھنی دیکھ رہا ہوں
بدنام ہوا خود بھی کیا اُن کو بھی رسوا	اختر تری آشفتہ سری دیکھ رہا ہوں

محمد منشار الرحمٰن خاں منشار

دل پہ زخم کھانے سے اشکِ خوں بہانے تک
ہم نے غم سہے کیا کیا کیفِ زیست پانے تک
فصلِ نو بہاراں کو کیا خبر کہ غنچوں پر
کتنے حشر گزرے ہیں کھل کے مسکرانے تک
دل نے عزم و ہمت سے کام لے لیا ورنہ
ہم پہ کیا نہیں بیتی آرزو بر آنے تک
منزلوں کی دشواری، راستوں کے سناٹے
ہیں تمام اندیشے اک قدم بڑھانے تک
اضطرابِ پیہم سے زندگی عبارت ہے
دل کی قدر و قیمت ہے نازِ غم اٹھانے تک
ہو فضا کی وسعت کا اُس کو خاک اندازہ
حدِ فکر ہو جس کی اپنے آشیانے تک
صرف چند محلوں میں "سیلِ نور" کیا معنی
بات جب ہے یہ پہنچے ہر غریب خانے تک
سچ تو ہے یہی منشار زندگی کی راہوں میں
تیرگی کا خطرہ ہے شمعِ دل جلانے تک

آزاد گلاٹی

آنکھوں کی ویران زمیں پر غم کے چلتے سائے ہیں
دل میں تیری یاد کے جھونکے ساون بن کر آئے ہیں
ہستی کی ہموار فضا سے بھی اکثر گھبرائے ہیں
یوں بھی ہوا ہے جانے بوجھے ہم نے دھوکے کھائے ہیں
تیرا بھی غم، میرا بھی غم، اور یہ اک ننھی سی جان!
واہ رے میرے دل کی جس نے کیا کیا بوجھ اٹھائے ہیں
اور نہیں تو غم کے موتی ڈال دے ان کے کاسے میں
پریم کے جوگی کیا جانے، کیا آشا لے کر آئے ہیں
جلتے دل پر آشاؤں کی اوس سے آنکھیں یوں نم ہیں
گیلے کوئلے جیسے کسی نے پھونکوں سے سلگائے ہیں
میرے اشکوں کی شمعوں کی لو کچھ بڑھتی جاتی ہے
جب سے ہار کے چاند ستاروں کے دیپک دھندلائے ہیں
کچھ عرصہ تو اور بھی نغموں میں ڈھل ڈھل کر بکھریں گے
ہم نے جو آزاد جوانی میں شعلے بھڑکائے ہیں

وحشی سیتاپوری

ترے خیال میں جب محو ہم نظر آئے	جھلکے جھلکے سے زمانے کے غم نظر آئے
وہ ابتدا تھی ہماری خود اختیاری کی	نہ جانے کیوں تجھے مجبور ہم نظر آئے
چلے جو راہِ محبت میں راہبر کے بغیر	ہمیں خود اپنے ہی نقشِ قدم نظر آئے
شریکِ محفلِ اہلِ طرب رہے ہم بھی	خوشی کے بھیس میں بھی جب الم نظر آئے

بہت قریب سے دیکھا جو شامِ ہجراں کو
ہمیں تمہاری ہی زلفوں کے خم نظر آئے

مراسلات :

مطالعات

ابھی حال میں معاصر (پٹنہ) کے شمارہ نمبر ۸ میں قاضی عبدالودود صاحب کے اشارات "مطالعات" کے عنوان سے نظر سے گزرے۔ قاضی صاحب کے سلسلہ "یادداشت" کے قبیل ہی کی یہ چیز بھی ہے جس سے اگر کوئی فائدہ اٹھانا چاہے تو مواد کی کمی نہیں۔ مگر اس مضمون میں (اگر اس کو مضمون کہا جائے) قاضی صاحب کا بیان ایک جگہ غلط فہمی پر مبنی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ قاضی صاحب کا اقتباس یہ ہے :

"دیوان اصغر (رام پوری) تاریخ ولادت فرزند مومن
"ابن شاعر + لاثانی + روئے الہام = ۴۲۴ + ۵۹۲ + ۲۰۱
= ۱۲۱۷ھ (یہ سنہ ولادت نہیں ہو سکتا)
... تاریخ ولادت فرزند مومن "صاحب بخت و جاہ کیوانی"
= ۱۲۱۵ھ (یہ مومن کی ولادت کی تاریخ ہو سکتی ہے
فرزند مومن کی نہیں)"

حقیقت یہ ہے کہ صاحب زادہ اصغر علی خاں[1] نے مومن کے فرزند احمد نصیر کے پیدا ہونے پر قطعہ تاریخ کہا تھا، جس کا مادہ یہ ہے۔

روئے الہام سے کہا کہ بڑھا   ابن شاعر پہ لفظ لاثانی

قاضی صاحب نے "ابن شاعر" (۴۲۴) اور "لاثانی" (۵۹۲) کے اعداد جمع کرکے الہام کا زر "الف" کو مانا اور اس طرح ۱۲۱۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ حالاں کہ "ال" کے اعداد جمع کرنا چاہئے تھے، جس سے مطلوبہ سال نکل آتا۔ یہ درست ہے کہ روئے الہام سے در اصل الف ہی مراد ہونا چاہیے مگر "الہام" پانچ حرفی لفظ ہے اور اس میں "الف لام" کو شاعر نے ابتدا۔ الف میم کو انتہا اور "ہ" کو وسط قرار دیا ہے۔۔ رہا یہ امر کہ "صاحب بخت و جاہ کیوانی" سے مادۂ تاریخ برآمد نہیں ہوتا میں عرض کروں گا کہ درست ہے اس لئے کہ یہ مادۂ تاریخ کا مصرع ہی نہیں ہے بلکہ محض قطعہ کا ایک مصرع ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے :

اس کو خالق نے اک دیا فرزند   صاحب بخت و جاہ کیوانی
جس کی عمر دراز کو بخشی   زلف دل دار کی سی طولانی
سال تاریخ کے لئے اصغر   تھی نہایت مجھے پریشانی
ہاتف غیب نے جو دیکھی   میری واماندگی و حیرانی
روئے الہام سے کہا کہ بڑھا   ابن شاعر پہ لفظ لاثانی
جب حروف و عدد شمار کئے   کھل گیا تب یہ سر پنہانی

(ظہیر احمد صدیقی، شعبۂ اردو۔ دہلی یونی ورسٹی۔ دہلی)

[1] نواب اصغر علی خاں ابن نواب عبداللہ خاں ظریف، مومن کے شاگرد تھے۔ بعض اصحاب کو غلط فہمی ہے کہ نواب اصغر علی خاں نسیم اور یہ ایک ہی شخصیت ہیں۔ جو صحیح نہیں۔

"اُردو اور مسلمان"

آپ کا اداریہ "اُردو اور مسلمان" سے مجھے کلی طور پر اتفاق ہے میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح بہت سے اردو دوست اس سے اتفاق خیال کریں گے۔

اُردو زبان کی موجودہ صورتِ حال کے اسباب و علل اثرات اور امکانات کا اختصار کے باوجود تقریباً تمام پہلوؤں کا تجزیہ اور وضاحت کی ہے آپ نے،

اس کے بعد مزید اظہار خیال کی بشرطیکہ اختلافِ خیال کی گنجائش نہ ہو، ضرورت نہیں رہتی۔ تاہم چند باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اُردو زبان کے ابتدائی دَور میں غیر مسلم حضرات اس سے اپنا علمی و ادبی اور فکری تعلق وابستہ نہ رکھتے تو آج یہ زبان بین الصوبائی بلکہ بین الملکی اہمیت اختیار نہ کرتی، اس کے دَور رس اثرات مرتب نہ ہوتے، ایسی ہمہ گیر مقبولیت اور اپنائیت کا شرف حاصل نہ ہوتا، اور یہ عہد یہ زبان کے بجائے ایک محدود گروہ کی بولی ہوتی۔

اگر غیر مسلم حضرات نے اُردو زبان کو معاشی اور اقتصادی تقاضوں کی بنا پر اپنایا تھا تو مغل آرٹ، فن تعمیر، موسیقی اور معاشرتی آداب میں کون سے معاشی و اقتصادی تقاضے مضمر تھے جنھیں غیر مسلم حضرات نے نہ صرف اپنایا بلکہ آج بھی عزیز رکھا ہے؟

اُردو کے مایوس دوست یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہندو دلی اور مسلمانوں میں معاشرتی اور تہذیبی لین دین اور میل جول کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا اب وہ ٹوٹ چکا ہے، اور اگر کہیں باقی رہ گیا ہے تو وہ سیاسی اور جماعتی سطح پر ہے۔

یعنی اب غیر مسلم حضرات کا اُردو زبان سے جو تعلق ہے وہ محض واجبی اور سطحی ہے اور پچاس سال بعد وہ بھی نہیں رہے گا۔

پھر نہ کوئی غیر مسلم بالک الف بے پڑھے گا۔ پھر نہ کوئی فطرت کا شیدائی مصوری میں مغلیہ آرٹ کی آمیزش کرے گا، پھر نہ کوئی معمار تعمیر میں مغلیہ طرز تعمیر کے خصائص برقرار رکھے گا۔

ان قیاسات اور خدشات کی تدبیر کا مطلب یہ تو نہیں کہ اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان تسلیم کر لیا جائے۔ اُردو کو مسلمانوں کی زبان تسلیم کر لینے سے اس کا مسئلہ تو حل نہیں ہوگا البتہ ہندی کے نادان دوستوں کے گمراہ کن خیالات کی توثیق ہوگی اور خود اُردو کے باہمت جوانوں کے حوصلے پست ہوں گے۔

اگر قومی زندگی میں مشترکہ تہذیب کی کوئی معنویت اور اہمیت ہے تو اُردو زبان کی بھی قدر و قیمت ہوگی ہی۔ ہاں اس کے حقوق کے تحفظ کے طریقۂ کار کے بارے میں اظہارِ خیال ہونا چاہیئے۔ (مقبول عالم)

اُردو اور قومی یک جہتی

یہ بات اب ایک تسلیم شدہ واقعہ ہے کہ اُردو زبان نہ صرف ہند و پاک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جاتی ہے۔ بلکہ یہ ایک عالمگیر زبان ہے۔ دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اُردو کا تیسرا مقام ہے۔

اس لئے اُردو قومی یک جہتی کے قیام کے لئے ایک مفید عنصر ثابت ہوگی۔ وہ علاقے جو ہندی کے علاقے سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں اُردو مختلف زبان بولنے والوں کے درمیان ایک کڑی کا کام کرے گی۔ اسکولوں کے طلبہ میں جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے اُن کو اُردو پڑھانے سے آپس کی یک جہتی اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے قریب آنے میں بڑی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی آج تو یہ عالم ہے کہ ہندی پڑھنے والے اور اردو پڑھنے والے طلبہ میں ایک بُعد پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔

انگریزی دور میں جب انگریزی زبان ذریعہ تعلیم تھی تو طلبہ میں آج کی بہ نسبت زیادہ یک جہتی اور زیادہ ہم خیالی پائی جاتی تھی۔ برخلاف اس کے آج یہ ہے کہ ہندی خواں طالب علم اپنے آپ کو شعوری یا لاشعوری طور پر حکمراں قوم کا فرد تصور کرتا ہے اور جس طرح انگریز اپنی زبان کو ہندوستانی زبانوں سے برتر سمجھتا تھا، وہ ہندی کو دوسری ہندوستانی زبانوں سے برتر سمجھتا ہے اور ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں کی طرف سے اگر شدید نہیں تو خفیف جذبہ تحقیر رکھتا ہے۔ یہ بات بہار، اور یو۔پی میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ برتری کا یہ جذبہ ہندی اور اردو پڑھنے والے طلبہ میں یکجہتی اور ہم آہنگی کیونکر پیدا کر سکتا ہے۔ ان کے اندر تو روز بروز دوری اور بُعد ہوتا جائے گا۔

ایک چیز اور ہے ہندی کے نئے نئے الفاظ جو ڈھل کر آ رہے ہیں ہندی خواں طلبہ اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے انہیں گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی زبان بولنے کی کوشش کرتے ہیں جو عام فہم نہیں ہوتی۔ نہ عام طور پر لوگ اس کو سمجھ پاتے ہیں یہ بات انگریزی اسکولوں سے زیادہ بیسک اسکولوں اور سنسکرت اسکولوں کے طلبہ میں پائی جاتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے والوں کا سوال تو الگ رہا۔ ایک ہی علاقے کے رہنے والوں کی یک جہتی پارہ پارہ ہو رہی ہے۔

اس بات کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ اُردو زبان کو اس کا صحیح مقام دے دیا جائے اس کو اینچ پیچ سے نکالا جائے۔ سہ لسانی فارمولے میں اُردو پڑھانے کا معقول انتظام ہو۔ بہار اور یو۔پی میں بہت کم اسکول ایسے ہیں جہاں اُردو پڑھانے والے مولوی نہ ہوں۔ ان اسکولوں میں بآسانی اُردو پڑھانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔

اُردو کے ذریعے ہم فرقہ پرستی کے زہر کو بھی بجھا سکتے ہیں۔ لسانی عصبیت کو کم کر سکتے ہیں۔ ملک کی ترقی پسند طاقتوں کو اُبھار سکتے ہیں۔ رجعت پرستی تنگ نظری پر ضرب کاری لگا سکتے ہیں۔

چین کے جارحانہ حملے کے خلاف ملک کو بیدار کرنے میں بھی اُردو ادباء اور شعراء نے جو رول ادا کیا ہے اس کا اعتراف خود وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کر چکے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر سہ لسانی فارمولے میں اُردو کو معقول حصہ نہ دینا حقائق سے مُنہ موڑنا ہے اور قومی یک جہتی کے مقاصد کو نقصان پہنچانا ہے اور ملک میں رجعت پسندی کو فروغ دینا ہے۔

(اخترعبدالسلام سکریٹری انجمن ترقی اُردو سہسرام)

شاخ کریم نگر (آندھرا)

اُردو کارکنوں کا تربیتی کیمپ

جناب ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری معتمد انجمن ترقی اُردو شاخ ضلع کریم نگر نے کریم نگر ضلع کے اُردو داں عوام اور اُردو تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں سے اپیل کی ہے کہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء کے آخری ہفتے میں اُردو تحریک کو وسعت دینے اور مستحکم بنانے کے لئے انجمن ترقی اُردو شاخ ضلع کریم نگر کی جانب سے اُردو کارکنوں کے لئے آٹھ روزہ تربیتی کیمپ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس کیمپ میں پنچایت سمیتیوں کی بنیاد پر کارکنوں کو شریک کیا جائے گا۔ ہر بلدیہ اور ہر پنچایت سمیتی کے حلقے سے کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین کارکن کیمپ میں شریک ہو سکیں گے۔ اُردو کارکنوں کے اس تربیتی کیمپ سے قبل کریم نگر ضلع میں اُردو کی حالت کے بارے میں مکمل مواد کی فراہمی ضروری ہے۔ مثلاً ہر مقام کی اُردو داں آبادی، اُردو تعلیم کے انتظامات، سرکاری سطح پر اُردو کا استعمال، اُردو کتب خانوں اور دارالمطالعوں کا قیام، سرکاری لائبریریوں میں اُردو کتب اور اُردو اخبارات و رسائل کے اعداد و شمار کے تعلق سے تفصیلی رپورٹ تیار کی جائے گی۔ اس لئے اس تعلق سے مکمل مواد دفتر انجمن ترقی اُردو شاخ ضلع کریم نگر (آندھرا پردیش) کے پتہ پر روانہ کیا جائے۔ متعلقہ تفصیلات کے لئے ضلع کی انجمن سے ربط پیدا کیا جائے۔

نیاز وارثی کو خطاب

روزنامہ پاسبان میں انجم کوثری اور نیاز امینی کی طرف سے اعلان شایع ہوا ہے کہ ۱۹۔ براڈوے بنگلور میں ایک جلسہ نیاز وارثی کے اعزاز میں ہوا۔ شہر کے اکثر ادبا، معززین اور افسران نے جلسے میں شرکت کی۔ جناب نیاز وارثی کو ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں "چراغ سخن" کا خطاب دیا گیا۔ اور جناب آتش صاحب کی طرف سے -/501 Rs کا کیسہ زر پیش کیا گیا۔ اور تقریریں کی گئیں۔ آخر میں "چراغ سخن" صاحب نے موزوں الفاظ میں شکریہ ادا فرمایا۔

شوکت تھانوی کے پسماندوں کو وظیفے

کتابی دنیا کراچی راوی ہے کہ شوکت تھانوی کی دو بیویوں اور بچوں کے لئے تین عدد پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے ہیں۔ سنا ہے کہ مرحوم کی تیسری بیوی بھی اپنا حق حکومت میں پیش کرنے والی ہے۔

اُردو داں عہدے داروں کے تقرر کا مطالبہ

روزنامہ ملاپ بحوالہ بھارت نیوز لکھتا ہے۔ حیدرآباد ۱۰ر اگست شری محمد احمد رکن بلدیہ نے بلدیہ میں اہم اور کلیدی عہدوں پر اُردو اور تلگو سے واقف عہدے داروں کو مقرر کرنے سے متعلق ۱۰ر اگست کو بلدیہ کے ملتوبہ اجلاس میں زیر بحث آنے والی قرارداد پر حقیقت پسندی سے غور کی اپیل کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ شہر حیدرآباد کے لاکھوں اُردو بولنے والوں کے اس واجبی جائز اور جمہوری مطالبے کو "جماعتی وقار" کے عنوان سے نظرانداز کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ چونکہ یہ اور ایسے ہی دوسرے مسائل کی یکسوئی کے سلسلے میں برسر اقتدار کانگرس بلدی پارٹی ہی پر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ شری الاپتی وینکٹ رامیا وزیر حکومت مقامی وضاحت کر چکے ہیں کہ تمام تبادلے میئر اور کمشنر بلدیہ کے مشورے ہی سے عمل میں لائے گئے تھے۔ لیکن اس وضاحت کے نتیجے میں پیدا شدہ شکوک و شبہات، اندیشوں اور بدگمانیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ بلدیہ میں اُردو سے واقف عہدے داروں اور ملازمین کو مقرر کرنے کے مطالبے اور جد و جہد کو سیاسی رنگ نہیں دینا چاہئے۔ بحیثیت مجموعی یہ مسئلہ اُردو بولنے والوں کی شکایات سے متعلق ہے۔ ۱۰ر اگست کو بلدیہ کے اجلاس میں اس قرارداد کی منظوری سے ریاستی حکومت پر اچھا اثر مرتب ہوگا۔ اور وہ ان شکایات کی یکسوئی کے لئے اقدامات کرے گی۔ شری محمد احمد نے بلدیہ میں متحدہ شہری کمیٹی، مجلس اتحاد المسلمین گروپ سے وابستہ اور دوسرے آزاد ارکان سے بھی اس تحریک کی پوری پوری تائید کرنے اور اسے متفقہ طور پر منظوری دینے کی درخواست کی ہے۔

بقیہ

حیدرآباد سے جوشؔ صاحب کی علیٰحدگی کے حقیقی اسباب

ہر چند اس وقت میں جوان اور سریع الاشتعال جوان تھا۔ لیکن نیازؔ صاحب کے کسی ایک مضمون کا بھی جواب نہیں دیا۔ البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی۔ لیکن اپنے دوست اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سُنانے کے بعد اس کو شایع بھی نہیں کیا اور چاک کر کے پھینک دیا۔ مضامین کے علاوہ نیازؔ صاحب نے اس زمانے میں میرے خلاف بڑے بڑے طویل خط بھی لکھے جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس گھر میں دھونی رما کر بیٹھا تھا وہیں دفن بھی کر دیا جاتا۔ میں نہایت واضح طور سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیازؔ صاحب کے اس فرطِ غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں ہے۔ کون معاف کر سکتا ہے ایک ایسے فرومایہ شخص کو جو اپنے دوستوں کو خود اپنے گھر پر بلا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیازؔ صاحب نے مجھ کو ایک ایسا ہی شخص تسلیم کر لیا تھا اور اس لئے میرے باب میں جو کچھ بھی لکھا وہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔"

ملاحظہ کیا آپ نے "نگار" کی جن تنقیدوں اور اس کے جواب میں جس نظم کا ذکر کیے اور اس نظم کے سُننے والوں کی ایک طویل فہرست کی بنیاد پر حیرتؔ صاحب نے اپنی روایت کی جو شاندار عمارت تیار کی تھی وہ خود جوشؔ صاحب کے ہاتھوں مسمار ہو گئی۔

من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید

ذرا غور کیجئے جو نظم صرف اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سنانے کے بعد چاک کر دی گئی وہ کسی اور کے ہاتھ کیسے لگ گئی اور نیازؔ صاحب تک پہنچا دی گئی۔ رہا دعوت والے واقعہ کا وہ حصہ جس میں جوشؔ صاحب کے کسی قرابت دار دوست کی "فحاشی" کی وجہ سے نیازؔ صاحب کے برہم ہو جانے کا ذکر ہے سو اس کے صحیح مان لینے میں کم از کم مجھے کوئی تامل نہ ہوتا لیکن میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ جوشؔ صاحب کے گھر نیازؔ صاحب کی یہ پہلی اور آخری دعوت نہیں تھی بلکہ جوشؔ صاحب کے حیدرآباد میں قیام کے بعد دو چار بار نیازؔ صاحب حیدرآباد آئے اور جتنی دفعہ وہ وہاں آئے اتنی ہی بار جوشؔ صاحب نے انھیں اپنے گھر مدعو کیا، دونوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور ۱۹۳۳ء تک جوشؔ صاحب کا کلام اکثر "نگار" میں شایع ہوتا رہا ہے۔ جوشؔ صاحب کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ پہلی اور آخری دعوت تھی، کیا کہا جائے۔ ع

گرفتن خطائے بزرگاں خطا است!

بس اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہی "عمر اور یادداشت" والی بات ہے۔ اب اس کہانی کے دوسرے کردار جناب ہوشؔ بلگرامی اور میرے والدِ محترم حضرت علی اخترؔ مرحوم کو جو اس نام نہاد "سازش" میں شامل کیا گیا ہے کچھ اس کے بارے میں بھی عرض کرتا چلوں۔

یہ بات واضح ہو چکی کہ جوشؔ صاحب نظام دکن کے مصاحبوں میں کبھی شامل نہیں رہے اور بقول جناب حیرتؔ اس زمانے میں "دربار شاہی میں ہوشؔ بلگرامی کی کمان چڑھی ہوئی تھی" اور خود حیرتؔ صاحب خوب جانتے ہیں کہ ہوشؔ صاحب نہ صرف نظام کے منہ چڑھے مصاحب ہی تھے بلکہ وہ محمدی فوج میں مددگار معتمد کے معزز عہدے پر بھی فائز تھے اور جوشؔ صاحب سے دُو، تین سو روپے زیادہ مشاہرہ پاتے تھے، اور یہ بھی حیرتؔ صاحب خوب جانتے ہیں کہ ہوشؔ صاحب نے کبھی "شاعرِ عزّہ" ہونے کا دعویٰ کیا نہ شاعری کو ذریعۂ عزت سمجھتے تھے۔ شعر کہتے ضرور تھے محض تفننِ طبع کے لئے، نہ کہ مقابلے اور موازنے کے لئے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ جوشؔ صاحب کی

طرف سے ان کے دل میں بغض و حسد کے جذبات پیدا ہو گئے' دونوں میں وہ کونسی قدر مشترک تھی جو وجہ "فساد" بنی؟ بحیثیت شاعر بھی "سریع الاشتعال" جواں سال جوش کو حیدرآباد کے درباری و سرکاری حلقوں میں وہ مقام حاصل نہیں تھا جو بادشاہ وقت کے استاد فصاحت جنگ جلیل کو حاصل تھا۔ اصل بات صرف اتنی ہے کہ خود جوش صاحب کے "عالم اشتعال" اور "عالم سرخوشی" نے ان کے بہترین دوستوں کو ان سے دور کر دیا۔ "نظام کے کان بھرنا" اور ان کے غصے کو "انتہا پر پہنچا دینا" اور غصے کے عالم میں نظام دکن کا ہر مصاحب سے جوش صاحب کی "شکایت" کرتے رہنا' یہ سب مضحکہ خیز باتیں ہیں' اور ان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیرت صاحب دربار نظام کا نہیں بلکہ کسی تعلقدار اودھ کی محفل کا حال سنا رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ جب نظام کو غصہ آتا تھا تو کس میں اتنی مجال تھی کہ دم بھی مار سکتا، اس کی واضح مثال تو خود جوش صاحب کے اخراج کا واقعہ ہے۔

کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما
کبھی دلبروں کی ثناخوانیاں کر!

اس نظم کو حیرت صاحب نے ان کی علیحدگی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اول تو یہ نظم نہیں بلکہ جوش صاحب کی ایک مسلسل بہاریہ غزل ہے اور یہ اخبار "صبح دکن" کے سنہ ۱۹۳۳ء کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوئی تھی، جناب ہوش بلگرامی تک اس کی نقل کا پہنچنا اور ان کا اسے نظام تک پہنچانے والی بات من گھڑت ہے۔ عموماً امراء اپنی خوشیوں کے موقع پر خود اپنی مدح خوانیوں کے منتظر رہتے ہیں۔ نظام نے جب اپنی سالگرہ کے موقع پر سالگرہ نمبر میں جوش صاحب کی یہ مسلسل غزل پڑھی تو اس کا انداز و آہنگ انھیں پسند نہ آیا۔ ویسے بھی ان کا مذاق سخن اگلے وقتوں کا تھا، چنانچہ نظام نے اپنی ناراضگی کا اظہار اسی اخبار "صبح دکن" میں ایک فرمان کے ذریعے کر دیا۔ اس مرحلے پر مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے اس قضیے کو ختم کروا دیا اور جوش صاحب حیدرآباد میں اپنی ملازمت پر کارگزار رہے، علیحدگی کا واقعہ تو کئی ماہ بعد پیش آیا اور اس کا تعلق اس نظم سے بالکل نہ تھا۔ "صبح دکن" کے فائل ابھی حیدرآباد میں موجود ہوں گے، اگر یہ واقعہ اتنا ہی اہم ہے تو کوئی صاحب ہمت ان کی تلاش کرے تو اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اخراج و علیحدگی کا حکم تو اس فرمان میں بھی موجود تھا۔ لیکن جوش صاحب کے معافی نامہ داخل کرنے کی وجہ سے واپس لے لیا گیا تھا، جوش صاحب کی علیحدگی میں ان کے اور شہزادہ معظم جاہ شجیع کے رندانہ مشاغل کو زیادہ دخل ہے، شہزادہ اعظم جاہ اور معظم جاہ کے درباروں اور ان کے مصاحبوں کی حرکات و سکنات کی ایک ایک اطلاع ہر روز صبح کو نظام کو دی جاتی تھی۔ نظام بادشاہ ہی نہیں باپ بھی تھے۔ اسی لئے یہ انتظام و اہتمام کیا گیا تھا۔ بیچارے شہید یار جنگ مرحوم کو بھی حیرت صاحب نے یونہی کراس میں گھسیٹ لیا ہے کہ انھوں نے فرقۂ امامیہ کی تبلیغ کے لئے جوش صاحب کو دربار معظم جاہ میں پہنچایا تھا، اور چونکہ جوش صاحب یہ کام انجام نہ دے سکے تھے اس لئے وہ بھی ان کے مخالف ہو گئے تھے اور جوش صاحب کے ساتھ مل کر نظام کے کان بھرنے لگے تھے۔

حیرت صاحب کہتے ہیں کہ یہ واقعہ خود جوش صاحب نے ان سے بیان کیا سو اس کی تصدیق یا تردید بھی وہی کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شہید یار جنگ نے کسی مجتہد کا کام جوش صاحب جیسے رند مشرب شاعر سے لینا چاہا، واللہ اعلم بالصواب، بہرحال علیحدگی کا جو واقعہ میں نے سنا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ کسی رات معظم جاہ کی ناؤ نوش کی محفل میں زیادہ غل غپاڑہ ہوا جس سے شہزادی نیلوفر برہم ہو گئیں اور انھوں نے اس کی اطلاع نظام کو کر دی۔ دوسرے دن "حاضر باشوں" کے ناموں کی فہرست نظام کے سامنے پیش ہوئی اس میں جوش صاحب کا بھی نام تھا، ایک بار وہ معتوب ہو ہی چکے تھے، پرانا غصہ تازہ ہو گیا اور نظام نے پندرہ دن کے اندر حیدرآباد کی حدود سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا۔ بادشاہوں کی مصاحبت ان کی ہاں میں ہاں ملانے سے چلتی ہے۔ نظام کو برہم دیکھ کر مصاحبوں نے ہاں میں ہاں ضرور ملائی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ ان میں ہوش صاحب بھی شامل ہوں' اور ایسے موقع پر وہ کر ہی کیا سکتے تھے! مہاراجہ کشن پرشاد نے پھر کوشش کی کہ یہ قضیہ بھی ختم ہو جائے لیکن نظام راضی نہ ہوئے، البتہ مہاراجہ کی سفارش سے اتنا ہوا کہ جوش صاحب کا تین سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا (جسے وہ پاکستان ہجرت کرنے تک حکومت حیدرآباد سے برابر وصول کرتے رہے ہیں) اور مکان بنانے کے لئے جو کئی ہزار کی رقم قرض لی تھی اسے بھی معاف کر دیا۔ اور خرچ سفر کے لئے بھی کچھ رقم کی منظوری دے دی۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں جوش صاحب کو ریذیڈنسی کا معتوب، انقلابی اور کمیونسٹ اور لامذہب دہریہ وغیرہ ثابت کرنا حیرت صاحب ہی کی دریافت ہے اس کے بارے میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

اب اس کہانی کے تیسرے کردار علی اختر مرحوم اور فانی مرحوم اور خود حیدرآباد کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(باقی)

ڈاکٹر محمد حسن کو استقبالیہ

۱۰؍اگست کو ایجوکیشنل کلاسز یونین ملازمین ہمدرد دواخانہ دلی کی طرف سے ڈاکٹر محمد حسن ریڈر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے طلبہ کے استفادہ کے لئے اردو زبان کے ارتقاء پر مختصر سی روشنی ڈالی۔ اس جلسے کی صدارت دواخانہ کے معاون متولی مولانا قاضی سجاد حسین نے فرمائی۔ صدر جلسہ نے آخر میں مہمانان کی تشریف آوری پر ان کا شکریہ ادا کیا اور یونین کے تعمیری پروگراموں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

(محمد سمیع صدیقی جنرل سکریٹری یونین ملازمین)

اردو شاعروں کو انعامات

از ہفتہ وار کیفی مالیگاؤں:۔ گزشتہ دنوں اردو ہندی سیوا سمتی جلگاؤں کے زیر اہتمام جیبی متنازعہ کے موضوع پر ایک کل مہاراشٹر مقابلہ ہوا جس میں دو اردو گیتوں کو انعامات دئے گئے۔ پہلا انعام جناب ابراہیم فیض (پونہ) کو ملا اور دوسرا انعام جناب خاور بانکوٹی (رتناگری) کو دیا گیا۔

اردو کے لئے باشندگان فتح گڑھ کی جدوجہد

۱۵؍اگست کے سیاست جدید کانپور میں احسن الزماں خاں صاحب ایڈوکیٹ تحریر فرماتے ہیں۔ باشندگان فتح گڑھ کی ایک مخصوص نشست میں مندرجہ ذیل تجاویز منظور ہوئیں:۔

تجویز ۱: مندرجہ ذیل حضرات کی ایک کمیٹی منتخب کی گئی جو ان طالب علموں کے والدین اور سرپرستوں سے ملے گی جن کی مادری زبان اردو ہے تاکہ ان سے تحریری مطالبہ کرایا جائے کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھنے کا باقاعدہ انتظام پرنسپل، ہیڈ ماسٹر صاحبان اور منتظمین کرائیں۔ اس سلسلے میں اگر تحریری نامنظوری ملے تو عدالتی چارہ جوئی کی جائے۔ کمیٹی کے ممبران یہ ہیں:۔

(۱) سید علیم النبی شاہ صاحب (ایڈوکیٹ)
(۲) مرزا اشرف علی بیگ صاحب سجادہ نشین درگاہ ستاریہ۔
(۳) منہاج الدین صدیقی صاحب (ایڈوکیٹ)
(۴) منشی ثناء اللہ صاحب (ایڈوکیٹ)
(۵) اشفاق عالم صاحب (ایڈوکیٹ)
(۶) جناب مختار الدین آسی صاحب۔
(۷) احسن الزماں خاں صاحب (ایڈوکیٹ) کنوینر۔

تجویز ۲: لسانی فارمولے کے بنیادی مقصد کو ٹھکرا کر اردو کے سلسلے میں جو خطرات ارباب حل و عقد نے پیدا کردئے ہیں ان کے دفع کرنے کے لئے تحریری مطالبہ کیا جائے جو اردو کے دوستوں کی طرف سے ہو۔ اس سلسلے میں وزیر تعلیم یو۔پی اور ڈائرکٹر تعلیمات کو متوجہ کیا جائے کہ باقاعدہ اردو پڑھانے کا انتظام کریں۔ جہاں اردو مادری زبان رکھنے والے طالب علم پڑھنا چاہتے ہوں۔

تجویز ۳: جلسے کے مقاصد کو عام کرنے کے لئے محلہ وار کمیٹیاں بنائی جائیں جو اردو مادری زبان رکھنے والے بچوں کے والدین اور سرپرستوں سے ربط پیدا کریں تاکہ ان کا سروے ہو سکے۔

اس جلسے کی صدارت جناب سید محمد طاہر صاحب وکیل فرخ آبادی نے کی۔

قومی یک جہتی کا مثالی اجتماع

۱۵؍اگست کو بزم سخن کا ایک جلسہ اور مشاعرہ گاندھی راشٹر بھاشا بھون کٹک میں منعقد ہوا جس کی صدارت پنڈت شری ان سویا پاٹھک جی نے فرمائی۔ اڑیا زبان کے مشہور ادیب و شاعر شری کالندی چرن پانی گراہی مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ قومی ترانہ اور سکریٹری کی ماہانہ رپورٹ کے بعد جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔

جناب امجد علی گریٹ نے انگریزی میں، جناب الیس صبحے وقف کمشنر نے اردو میں، اور سابق وزیر تعلیم شری راد ھاناتھ رتھ نے ہندی میں تقریریں کیں اور سب نے یہی کہا کہ قومی یک جہتی کی بہترین مثال یہ مشاعرہ ہے جس میں اردو، ہندی اور اڑیا زبان کے شاعر اور کوی آج ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ اس میں ہر زبان خصوصاً اردو ہندی ایک دوسرے سے قریب ہو رہی ہیں۔ ایسے جلسے فی الوقت ہمارے ملک میں بہت ضروری ہیں جو ہمارے اتحاد کو مضبوط کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

مشاعرے میں تقریباً بیس شعرائے کرام نے حصہ لیا تھا اور ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزلوں اور نظموں میں شمیم الولوی، ضمیر خاں ضمیر، کرامت علی کرامت، ادم پرکاش بھگت، رحمن شاکر اور حکیم بنگالی کی غزلیں اور حفظ الباری حافظ، رفیق درد، امجد نجمی، کالندی چرن پانی گراہی، واسودیو سنگھ اور عبدالصمد پربھی کی نظمیں بہت پسند کی گئیں۔ (عبدالصمد پربھی)

سہ لسانی فارمولا

حکومت سہ لسانی فارمولے کو جس شکل میں نافذ کرنا چاہتی تھی، نئے سال سے اس کو جاری کر دیا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہنے کیلئے اُردو کی تعلیم کی گنجائش بھی رکھی جائے لیکن شکلیں ایسی اختیار کی جائیں کہ اسکی تعلیم کا دروازہ عملاً بند ہو جائے، سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکی تعلیم کا انتظام تو ہر اسکول میں ہو جائے گا اور اُردو کا مشکل سے کچھ اسکولوں میں ہو سکے گا۔ اس طرح اُردو کی تعلیم خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اُردو کے معاملے میں حکومت سے کسی انصاف کی توقع رکھنا محض خوش فہمی ہے، اگر اُردو کے حامی اسکو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ جن طلبہ کی مادری زبان اُردو ہے وہ اُردو لینا اپنا فرض بنا لیں خواہ اس میں ان کو کچھ نقصان بھی برداشت کرنا پڑے۔ اگر اُردو پڑھنے والے طلبہ قابل لحاظ تعداد میں ہو جائیں تو سب میں نہ سہی کچھ نہ کچھ اسکولوں کو اُردو کی تعلیم کا انتظام کرنا پڑے گا مگر سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم گاہوں تک جہاں جہاں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے اُردو کے طلبہ کی تعداد برابر گھٹتی جاتی ہے مسلم اسکولوں میں بھی یہی افسوسناک حالت ہے۔ ایسی حالت میں تنہا حکومت کی شکایت کرنا بیکار ہے۔ اس میں طلبہ اور اُن کے والدین کا بھی قصور ہے۔

(از شذرات رسالہ معارف اعظم گڈھ)

تامل ناڈ اُردو کانفرنس

تھاور ال ترچناپلی میں تامل ناڈ اُردو مجلس کے زیر اہتمام امیر الدین احمد کی صدارت میں ۲۰ ر ۲۱ رجولائی کو ایک آل انڈیا مشاعرہ اور تیسری ریاستی اُردو کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا۔ کانفرنس کی تجاویز کا خلاصہ یہ ہے،

(۱) محکمۂ اطلاعات و نشریات کے تعاون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے درخواست کی گئی کہ آل انڈیا ریڈیو ترچناپلی اور مدراس سے اسی طرح اُردو میں نشر و اشاعت کی مستقل سہولتیں دی جائیں کیونکہ اُردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان علاقوں میں آباد ہے۔

(۲) سائنس اور ثقافتی امور کی وزارت سے درخواست کی گئی کہ مدراس کی ساہتیہ اکاڈمی کی علاقائی شاخ میں ایک اُردو داں عہدیدار مقرر کیا جائے تاکہ مختلف فرقوں اور طبقوں میں زیادہ سے زیادہ جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو۔

(۳) سرکاری اشتہارات اور اعلانات اُردو جرائد میں بھی شائع کرائے جائیں۔

(۴) اُردو مدرسین اور اہل علم کا ایک سمینار منعقد کیا جائے جو ان مسائل اور عملی دشواریوں کا جائزہ لے جو ریاستی حکومت کی آزادانہ پالیسی پر عمل درآمد کی راہ میں حائل ہیں۔

مالک انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اُردو ہند سے شائع کیا